

حکمتِ سیدِ مودودی

سورۃ عصر کے معارف

جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ ”درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے۔“ تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اس سورۃ کی رُو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرار ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (مثلاً النساء آیت ۱۳، المائدہ آیت ۵۴، الانفال آیت ۲۲، التوبہ آیت ۳۸، اور الصّف آیت ۲ میں) لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے اور عربی زبان میں یہی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ یُؤْمِنُ میں اَمَنَ لَہُ کے معنی ہیں صَدَقَہُ وَاعْتَمَدَ عَلَیْہِ (اس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا) اور اَمَنَ بِہِ کے معنی ہیں اَلْیَقِنَ بِہِ (اُس پر یقین کیا) قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے اُس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا

اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ

يَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ ثُمَّ كَفَرُوا

پڑے۔

(المجرات - ۱۵)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے

اور پھر اس پر ٹوٹ گئے۔

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر

کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ

اسْتَفْتَمُوا (الحجۃ - ۳۰)

أَتَمَّ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا

ذَكَرُوا اللَّهَ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ

(الأنفال ۲)

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ

مَحَبًّا لِلَّهِ (البقرہ ۱۷۵)

فَلَا دَرَسَ لَكَ لَا يُؤْمِنُونَ

حَتَّىٰ يَخْلَعُوا لِي فِيهَا شِجَرَ

يُنْهَمُّ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي

أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ

وَيَسْلَمُونَ سَلِيمًا (النساء ۶۵)

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے

بڑھ کر اللہ کی محبت رکھتے ہیں۔

پس نہیں، (اے نبیؐ) تمہارے رب کی قسم

وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی

اختلاف میں نہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں،

پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی

کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سرسری تسلیم کر لیں۔

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں ربانی اقرار ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور

یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا

بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (النساء ۱۳۶)

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح

اس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد اولاً اللہ کو ماننا ہے محض اس کے وجود

کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک

نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجا لائے۔ وہی

قسمیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکل

کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت

کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا

ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً رسولؐ کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا آدمی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسليم ہے۔ اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء اور کتب الہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسولؐ نے دی ہیں۔ ثامناً آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے۔ اور اس محاسب میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزا، اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے، جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے فیکل اور مصلحتی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے

رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیچ اور سخت کا سا ہے۔ جب تک بیچ زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیچ زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیچ زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی جو ایمان لا کر عمل صالح کریں، اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورہ بالا دو صفیتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد یہ سورۃ مزید دو صفیتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاً تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ ان کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اس معاشرے میں یہ موضوع جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی

اس طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ممانعت ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورہ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زبانیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا۔ اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سب کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ سچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ (آیت ۲۵)۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران - ۱۰۴) اور اُس اُمت کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران - ۱۱)۔

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور اُن کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اُس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے اُن کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم)